سردار اعوان

خلافت عثمانیہ کے انہدام میں کس کا کیا حصہ تھا؟

ڈاکٹر سونیل کی کتاب "Minorities and the Destruction of Ottoman Empire" جسے ترکی کی ہسٹاریکل سوسائٹی نے شائع کیا ہے، تحقیق کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ پروفیسر سونیل کے اسے مکمل کرنے میں دو سال لگے۔ اس میں جو دستاویزات شامل کی گئی ہیں ان کو جمع کرنے میں کوئی پچیس سال کا عرصہ صرف ہوا۔ کتاب پانچ بڑے حصوں میں تقسیم ہے، سلطنت عثمانیہ کے دور عروج (۱۵۶۶ء-۱۶۸۰ء) اور اس کے تاریخی پس منظر سے شروع ہوتی ہے اور دورِ زوال (۱۷۸۹ء-۱۹۱۴ء) پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔

۱۰۱۷ء میں بازنطینی افواج کو شکست دے کر ترکوں نے جس عظیم خلافت کی بنیاد رکھی، اس کا دائرہ اپنے عروج کے دور میں تین براعظموں ایشیا، افریقہ اور یورپ پر محیط تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ میل جول کے نتیجے میں بلقان میں بہت سارے لوگوں نے، خاص کر آرتھوڈکس عیسائیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اگرچہ نومسلموں کی بڑی پذیرائی ہوئی، مگر انہیں کبھی بھی اس پر مجبور نہ کیا گیا کہ وہ لازماً مسلمان ہو کر رہیں۔ بالادستی تو یقیناً اسلام کی ہوگی، لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا جائے۔ کتاب میں برطانوی تاریخ دان پروفیسر ڈکن کا حوالہ دیا گیا ہے جس کے مطابق خلافت کے اندر عیسائی، یہودی اور دوسری کئی قومیں آباد تھیں۔

ڈاکٹر سونیل نے اپنی کتاب میں تین قوموں یعنی، یونانیوں، آرمینیوں اور یہودیوں کو خصوصی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ انہیں درحقیقت اقلیت شمار نہیں کیا جاتا تھا۔

خلافت عثمانیہ کا دستوری اور قانونی ڈھانچہ زیادہ تر اسلامی قوانین پر مبنی تھا جس کی رو سے سلطان کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے نائب کی تھی نہ کہ حاکم مطلق کی۔ اسے جو بھی اختیارات حاصل تھے وہ قرآن و سنت کے اندر اندر تھے۔ خلافت کے اندر جو بھی اقوام موجود تھیں ان میں سے ہر ایک "ملت" شمار ہوتی تھی اور انہیں اندرونی طور پر وسیع اختیارات سے نوازا گیا تھا۔ اسلامی ریاست میں آپ کو معلوم ہے غیر مسلموں کو "اقلیت" نہیں "اہل ذمہ" قرار دیا گیا ہے، یعنی ریاست ان کی جان، مال اور عزت و آبرو کا ذمہ لیتی ہے۔ ہر صاحب نصاب مسلمان سے حکومت اڑھائی فیصد زکوٰۃ وصول کرتی ہے اور ان کے لیے فوج کی ملازمت لازمی ہوتی ہے، لیکن اہل ذمہ جنہیں مخفف کے طور پر ذمی کہا جاتا ہے، خلافت کے لیے

لڑی جانے والی کسی جنگ میں شمولیت کے پابند نہیں۔ انہیں صرف جزیہ ادا کرنا پڑتا ہے، مگر یہ بھی صرف ان لوگوں سے لیا جاتا تھا جو کام کاج کے قابل ہوتے تھے۔ کمزور یا ضعیف افراد، عورتیں، بچے، راہب اور پادری وغیرہ جزیہ کی ادائیگی سے مستثنیٰ ہوتے تھے۔ اسلامی قانون کے ماہرین جزیہ کی مقدار کے بارے میں مختلف آراء پیش کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایک امیر شخص سے اڑتالیس درہم، اوسط آمدنی والے شخص سے چوبیس، کم آمدنی والے سے بارہ درہم وصول کیے جائیں گے۔ امام شافعی کے نزدیک کم سے کم ایک دینار (سو درہم) لیا جائے گا، جبکہ زیادہ سے زیادہ کا فیصلہ سلطان کرے گا۔ امام مالک کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ دونوں کا فیصلہ سلطان کی مرضی پر چھوڑتے ہیں۔ بہرحال اس کی مقدار زکوٰۃ کے مقابلے میں کہیں کم ہوتی ہے۔

غیر مسلموں کو اسلامی شریعت کی رو سے جو حقوق دیے گئے ہیں، سلطان اپنا یہ دینی فریضہ سمجھتا تھا کہ وہ پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ ادا کیے جائیں۔ خلافت عثمانیہ میں ہر "ملت" اپنے اپنے دائرہ کے اندر خود مختار تھی۔ وہ اپنے سب سے بڑے مذہبی پیشوا کا انتخاب کرتی، جو "ملت" کے تمام معاملات کی دیکھ بھال کرتا اور حکومت کے سامنے اس کی نمائندگی کا فریضہ انجام دیتا۔ مذہبی امور کے علاوہ ان کے لیے قائم کردہ سکولوں کا انتظام انہیں کے پاس تھا، یہاں تک کہ بعض دیوانی مقدمات کے فیصلے ان کے اپنے ہاں ہوتے جس کے لیے انہیں حکومت کی طرف سے ہر قسم کی مدد فراہم کی جاتی۔

ولیم ملر ترکوں کا دوست شمار نہیں ہوتا، وہ اپنی کتاب "Ottoman Empire and its Successors" (شائع شدہ لندن: ۱۹۶۶ء) میں تسلیم کرتا ہے کہ "یہ کہنا بے جا نہیں کہ ترکوں کی حکومت میں جتنی مذہبی رواداری موجود تھی اس کا عشر عشیر بھی عیسائیت کے علمبردار اپنے ہاں پیش نہیں کرتے۔" ایڈگر گردان ویل "The Conspiracies and the Tsarist Russia" میں یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ غیر مسلموں کو جو تحفظ اور استحکام حاصل ہوا ہے، اس کے لیے انہیں ترکوں کا احسان مند ہونا چاہیے۔ عثمانیوں کی منصف مزاجی اور راست بازی پر کسی کو انگلی اٹھانے کی جرات نہیں ہوئی۔ ان کا اگر کوئی "جرم" تھا تو صرف یہ کہ انہوں نے نہایت اعلیٰ پیمانے پر تمام تر کوششوں کے باوجود، ان میں پوپ پائس دوم کی طرف سے فاتح سلطان محمد دوم کو دی گئی ذاتی دعوت خاص طور پر قابل ذکر ہے، عیسائی مذہب قبول نہیں کیا۔ چنانچہ ادھر سے مایوس ہو کر صلیبیوں نے اپنی اس مہم کا آغاز کیا جس کا مقصد اسلامی رشتوں کو کمزور بنا کر ترکوں کی طاقت کو پارہ پارہ کرنا اور انہیں بلقان، اناطولیہ اور اگر ممکن ہو تو مشرق وسطیٰ سے بے دخل کرنا تھا۔ اپریل ۱۹۱۵ء میں ایف - اے - ایلو نامی شخص نے جو ارمیا کے روسی قونصل خانہ میں بطور مترجم تعینات تھا، برطانوی دفتر خارجہ کو یاد دہانی کے طور پر تحریر کیا تھا کہ اسلام کی سربراہی ترکی کو حاصل ہے۔ اگر ترکی صحیح وسالم رہا تو دنیا سے اسلام کا خطرہ کبھی دور نہیں ہوگا اور اگر ترکی کا خاتمہ ہونے لگا تو مسلمان کوئی حرکت نہیں کریں گے، اور آئندہ ہمیشہ کے لیے

دب کر رہنے پر مجبور ہوں گے۔

سلطان سلیمان، جنہیں سلیمان اعظم کہا جاتا ہے، کے دور میں ایک طرف خلافت اپنی عظمت اور سطوت کی ثریا کو چھو رہی تھی تو دوسری طرف اس کے زوال کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ سلطان سلیم دوم کی تخت نشینی کے ساتھ ہی عیسائیوں کو اسلام کے خلاف اپنی روایتی چالاکی اور مکاری کے استعمال کا موقعہ ہاتھ آ گیا۔ بہت سی غیر مسلم خواتین حرم کی زینت بن گئیں۔ حکومتی اختیارات کا خاصا بڑا حصہ سلطان کی ان غیر مسلم سوتیلی ماؤں اور ان کے رشتے سے چچا زاد اور خالہ زاد بھائیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ محلاتی سازشوں کے ذریعے ایسے لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو گئے جو صرف نام کے مسلمان یا پھر غیر مسلم ہی تھے۔ نہ صرف یہ کہ ان کی وفاداریاں منقسم تھیں بلکہ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ سلطان کے اختیارات رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے، جبکہ وزیر اعظم اور اس کے وزراء کے زیادہ، حالانکہ خلافت میں اصل مقام و مرتبہ صرف سلطان کو حاصل ہوتا ہے۔ گویا سیاسی مرکز تو ایک ہی یعنی سلطان کی ذات رہی، لیکن اختیارات کے مراکز کئی ہو گئے۔ اس سے حالات پر حکومت کی گرفت کمزور پڑنے لگی تو اسے فکر لاحق ہوئی۔ پھر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جس جگہ خرابی ہوئی ہے اس کی نشاندہی کر کے ازالہ کیا جاتا تاکہ گاڑی واپس پٹڑی پر آ جاتی، مگر یورپ کی "روشن خیالی" کی پیروی میں "اصلاحات" کی راہ اختیار کر لی گئی۔ اس بہانے یہودی، عیسائی اور آرمینائی آ کر کلیدی عہدوں پر براجمان ہو گئے جو مغربی تصورات کو پھیلانے کا بہت موثر ذریعہ ثابت ہوئے۔

خلافت میں کئی رنگوں، نسلوں، زبانوں، ثقافتوں، مذہبوں اور قومیتوں کے لوگ آباد تھے جو تین براعظموں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں عرب، ایرانی، ترک، سلاوی، افریقی سبھی شامل تھے جو سب اپنے اپنے ممالک میں الگ الگ قومیں شمار ہوتے تھے۔ جب حالات بگڑنے لگے تو ہر قوم دوسری قوم کو اس کا مورد الزام ٹھہرانے لگی۔ خاص طور پر ترکوں نے عربوں کو اور عربوں نے ترکوں کو اس کا ذمہ دار قرار دینا شروع کر دیا، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ الزام تراشی کی اس مہم میں دونوں طرف پیش پیش غیر مسلم باشندے تھے۔

"ترکوں سے گلوخلاصی" کا یہ عمل دراصل ۱۶۸۳ء میں شروع ہو گیا تھا جب ترک ویانا فتح کرنے میں ناکام رہے تھے۔ چنانچہ ولیم ملر اسے خلافت عثمانیہ کے خاتمے کی جانب پہلا قدم قرار دیتا ہے۔ یورپی استعمار نے اسی روز سے سلطنت عثمانیہ کے حصہ بخرے کرنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ ترک نیشنلزم اور عرب نیشنلزم کے حوالے سے جو زہر اس وقت پھیلایا گیا تھا، اکثر دانش ور اسے آج بھی اتنا ہی موثر اور جاری و ساری خیال کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا یہ عمل ہنوز جاری ہے۔ بہرحال اپنوں کی نادانی اور غیروں کی چالاکی کا یہ شاخسانہ تھا کہ بلقان اور اناطولیہ کے بعد خلافت عثمانیہ کا بھی بالآخر خاتمہ ہو گیا۔

۱۶۸۳ء میں ویانا اور ۱۹۲۳ء میں لوزانے (Lausanne) میں جو ہوا سو ہوا، خلافت کے خلاف سازشوں، تخریب کاریوں اور جارحیت کی ایک لمبی داستان ہے جو ڈاکٹر سلاجی - آر- سونیل بیان کرتے ہیں- وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح خلافت کے اندر آرام و چین سے زندگی گزارنے والے غیر مسلموں نے یورپی طاقتوں کا ساتھ دے کر ان کا کام آسان بنایا، حالانکہ انہیں یورپ کی نسبت یہاں زیادہ تحفظ حاصل تھا- خلافت عثمانیہ اپنی اندرونی کمزوریوں کے سبب یورپ سے قرضے لینے پر مجبور ہوئی تو رہی سہی عزتِ نفس بھی جاتی رہی- اب یورپ والوں کی ہر بات ماننا پڑتی اور ان کی تجویز کردہ اصلاحات پر عمل کرنا پڑ رہا تھا- ادھر حدود خلافت میں مقیم یہودی الگ اپنے صیہونی عزائم کی تکمیل میں لگے ہوئے تھے- وہ "پیار ہی پیار" میں چاہتے تھے کہ یروشلم اور فلسطین انہیں حاصل ہو جائے-

۱۸۵۶ء میں پیرس میں یہ معاہدہ طے پایا کہ اب سے سلطان کی عیسائی رعایا کی حفاظت یورپ کے ممالک کریں گے، یعنی کیتھولک فرقہ فرانس، اٹلی اور آسٹریا کے زیر سایہ ہوگا- برطانیہ، جرمنی اور امریکہ پروٹسٹنٹ مذہب کے نگہبان اور روس آرتھوڈکس کا سرپرست اعلیٰ قرار پائے- اس طرح خلافت کے اندر موجود عیسائیوں کی باگ ڈور مکمل طور پر غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی- مغربی استعمار نے اپنے ناپاک سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے ان عیسائیوں کے مسائل نہ صرف بڑھا چڑھا کر پیش کیے بلکہ ان میں مصنوعی طور پر اضافہ کیا گیا تاکہ انہیں مداخلت کا بہانہ ملتا رہے جیسا کہ برطانوی قونصل، پلگریو نے ۱۸۶۶ء میں اپنی رپورٹ میں لکھا ہے- یورپی طاقتوں نے ہر ممکن طریقے سے مقامی عیسائیوں کے ذریعے بے چینی اور بدامنی کو ہوا دے کر خلافت کے اندر نقب لگانے کی کوششیں کیں- عیسائیوں کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے مشنری اداروں نے بڑی تعداد میں آکر تبلیغ کے بہانے یہاں اپنے پیر جما لیے اور خلافت کے اندر رہنے والے عیسائیوں پر اپنا قبضہ جما کر انہیں اپنی سرپرست یورپی طاقتوں کے زیر اثر لا کھڑا کیا-

یورپ والے ایک طرف عثمانیوں کو یہ ترغیب دلاتے رہے کہ تمہارا تعلق وسط ایشیا سے نہیں، یورپ سے ہے، دوسری طرف جنوبی اور وسطی یورپ سے عثمانیوں کا صفایا کرنے میں مصروف رہے- اور ایک ایک کر کے تھریس، بوسنیا ہرزیگووینا اور بلغاریہ کو خلافت عثمانیہ سے کاٹنے میں کامیاب ہو گئے- عثمانی عمائدینِ سلطنت اگرچہ عیسائیوں کی ریشہ دوانیوں سے سخت نالاں تھے اور بعض اوقات انہیں تادیبی کارروائی بھی کرنا پڑتی، مگر بحیثیت مجموعی حکومت نے غیر مسلموں سے متعلق اسلامی اصولوں پر مبنی اپنی عدل و انصاف، نرمی اور رواداری کی پالیسی ہاتھ سے نہ جانے دی، تاہم خلافت کو جو زوال آ چکا تھا اس کے سبب اندرونی خلفشار اور بیرونی حملوں کا بیک وقت مقابلہ کرنا ممکن نہ رہا اور بالآخر ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم میں شرکت نے خلافت کا رہا سہا بھرم بھی ختم کر دیا- یہ پوری تاریخ لالچ کی کارفرمائی اور سازشوں کے تانے بانے سے بھری پڑی ہے- لالچ اور حرص نے عثمانیوں کو ناکارہ بنا دیا اور

عیسائی سازشوں نے ان کی ناکامی پر مہر ثبت کر دی۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمے میں نمایاں کردار اگرچہ اس کی عیسائی آبادی کا نظر آتا ہے، مگر اسے موقع تو خود عثمانیوں نے فراہم کیا، لیکن بہرحال یہ بات خوش آئند ہے کہ مسلم دنیا میں اپنے ماضی میں جھانکنے کا خیال تو پیدا ہوا ہے۔ (پندرہ روزہ "ندائے خلافت" ۲۱ مارچ ۱۹۹۴ء)